فیض احمد فیضؔ......شاعرِ عصر

عظیم اللہ جندران

Azeemullah Jundran

Ph.D Scholar, Department of Urdu,

Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Environment affects on the poetry of a poet. Progressive Movement launched in 1936. Faiz was also part of this campaign. He helped the freedom movement against the struggle of British Tyranny. He observed that there was no benefit to life without freedom. He was revolutionary poet and always stood with truth. The centtral motive of Faiz poetry was lonely and waiting. Faiz era was consist of violation of law and order, maltreatment and injustice. Faiz poetry deals with poor and injustice distribution of wealth. Faiz poetry explored the dignity of human being. Faiz favoured the rights of poor.

تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعرِ عصر تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز
(فارغ بخاری)

شاعر جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے وہ شاعر پر اثر انداز ہوتا ہے۔فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر تھے۔ان کی شاعری انقلابی عناصر کی حامل ہے اور دنیا کو تبدیل کر دینے کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ حقیقت سے گریز نہیں کرتی بلکہ حقیقت کو بدصورت اور حُسن کو نمایاں کرتی ہے۔ بدصورتی سے نفرت اور حُسن سے محبت پیدا کرتی ہے۔ دنیا کی بدصورتی میں سب سے بھیانک مفلسی اور بے حسی کے لحاظ ہیں جن کی بڑی دلدوز تصویریں ترقی پسند شعراء نے کھینچی ہیں۔فیض احمد فیض کا دل صرف اس مفلسی اور غلامی پر نہیں کڑھتا بلکہ یہ خیال بھی ستاتا ہے کہ نئی پُود بڑی ہو کر غلام ہو جائے گی۔ یہ مایوسی کی ترغیب نہیں بلکہ انسانی ضمیر کو تازیانہ لگانے کا ایک طریقہ ہے۔

....

شاعر جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ وہ شاعر پر اثر انداز ہوتا ہے شاعر اسی معاشرے کا انسان ہے اور ظاہر ہے اس کے موضوعات بھی اسی معاشرے سے متعلق ہوں گے۔ ماحول اگر ساز گار نہیں ہوگا تو اس کا لازمی اثر شاعر کی شاعری پر ہوگا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ تو وہ اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد میں تحریک آزادی کا ساتھ دیا۔ آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ آزادی کے باوجود عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ چنانچہ انھوں نے غریب عوام کی بیداری کو اپنا فرض جانا۔ عوام کے مسائل پیش کیے۔ ان کی بدحالی سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ فیض انقلابی تھے، وہ انقلابی تحریک کا منتہائے کمال ہے۔ آج ایک عالم اس انقلابی تحریک کے سائے میں زندگی گزار رہا ہے۔ ترقی پسند شعراء کی شاعری انقلابی عناصر کی حامل وہ حقیقت سے گریز نہیں کرتی بلکہ حقیقت کی بدصورتی اور حسن کو نمایاں کرتی ہے۔ بدصورتی سے نفرت اور حسن سے محبت پیدا کرتی ہے۔ دنیا کی بدصورتی میں سب سے زیادہ بھیانک مفلسی اور بے حسی کے نظارے ہیں جن کی بڑی دلدوز تصویریں ترقی پسند شعراء نے کھینچی ہیں۔ فیض احمد فیض کا دل صرف اس مفلسی اور غلامی پر ہی نہیں کڑھتا بلکہ یہ خیال بھی ستاتا ہے کہ نئی پود بڑی ہو کر غلام ہو جائے گی۔ یہ مایوسی کی ترغیب نہیں بلکہ انسانی ضمیر کو تازیانہ لگانے کا ایک طریقہ ہے:

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے ہے کہ: کسی فرد یا شاعر کا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردعمل سے تشکیل پاتا ہے۔ یوں تو انسان کے شعور پر نہ جانے کتنی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ہر منزل اس کے شعور کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتی ہے اور اس پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن اصل چیز معاشی زندگی کے حالات ہیں جو سماجی اور معاشرتی احساس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔(۱)

فیض احمد فیض کے یہاں زندگی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کی موجودگی میں ایک سرمستی ہنگام کا نام ہے، مگر وہ اس میں سے فقط عطر محبت کے کشید کرنے کو حاصل زندگی قرار دیتے ہیں۔ ان کی فکر قومی امنگوں کی ترجمان ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے زندگی کو خود بہت غور سے، بہت قریب سے بلکہ ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ وہ ایک ایسے سربلند شاعر ہیں کہ بطور شاعر انھوں نے موت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھ کر کئی سال تک اس زندہ رومانوی فلسفہ کو جانچا ہوگا۔(۲)

اُن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کو اپناتے ہوئے کہیں بھی کلاسیکی روایت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ انھوں نے ترقی پسندانہ موضوعات کو روایتی شاعرانہ عنصر کے آمیزے میں جذب کر کے ایک تازہ مرکب تیار کیا۔ جس میں روایتی لذت بھی تھی اور جدید ذائقہ بھی۔ فیض کی نظموں میں سامراجی تسلط کے خلاف اظہار خیال ملتا ہے۔ انھوں نے بڑی جرأت مندی سے آزادی کے نعرے لگائے:

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

فیض کی شاعری میں غلامی سے نجات اور آزادی کا نعرہ گونجتا رہا۔ کبھی یہ نعرہ سامراجیت کے خلاف تھا اور کبھی یہ نعرہ وطن عزیز میں پائی جانے والی ناگفتہ بہ سیاسی صورت حال کے خلاف تھا۔ فیض احمد فیض نے ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے

انگریز سامراج کے خلاف آواز بلند کی۔۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں پائی جانے والی سیاسی صورت حال، مارشل لاء اور سامراجی طور طریقوں کے خلاف اظہار خیال کرتے رہے۔فیضؔ کی شاعری داخلی احساسات ان کے جذبات ان کی آرزوں کی تمناؤں کی آئینہ دار ہے۔ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسیری کے زمانے کی پیداوار ہے۔نقادوں کے نزدیک فیضؔ کی بہترین ان کی اسیری کے زمانے کی شاعری ہے۔فیضؔ کے جیل کے ساتھیوں کے بیان کے مطابق ان کے چہرے پر کبھی پریشانی اور سراسیمگی کے آثار نہیں دیکھے گئے۔ان کے چہرے پر ہمیشہ سکون، شگفتگی اور دلکش مسکراہٹ رہی۔فیضؔ کی شاعری کا خاصہ بڑا حصہ اسی زمانے کا ہے۔فیضؔ کے مجموعے ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں خاص طور پر اسیری کے دنوں کی یادیں بکھری ہوئی ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

فیضؔ انسانی عظمت کے قائل تھے۔اس انسانیت کے جو ظلم کے ہاتھوں مجبور تھی۔ان کی شاعری کا بنیادی موضوع حب الوطنی بھی ہے۔۱۹۴۷ء سے پہلے یہ جذبہ سامراجیت کے خلاف نعرہ بن کر ابھرا:

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

۱۹۴۷ء کے بعد جذبۂ حب الوطنی پاکستان کے لیے وقف ہوگیا۔انھوں نے وطن کو بالکل محبوب کی طرح چاہا۔سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ وپے میں سرایت کرگئی ہے کہ اب اس کی دوسری محبتوں سے علیحدہ کرکے دیکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔''(۳)

وطن سے محبت کی شاہکار نظم ''نثار میں تیری گلیوں میں'' ہے:

نثار میں تیری گلیوں میں اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم وجاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست وکشاد
کہ سنگِ وخشت مقید ہو اور سگ آزاد

اور پھر آزادی کے بعد حالات کے تبدیل نہ ہونے کا شکوہ اس طرح موجود ہے۔

یہ داغ داغ اُجالا ، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

اپنی نظم ''ربا سچیا'' میں اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ربا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نَیب تے عالیجاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کدّ پچھیا ای
کیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی اُو ربّ سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہ کیتیاں نیں
کِتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کِتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈیاں چ کلپے جان میری
جیویں پھاہی چ کُونج کُرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

فیضؔ کا اصل موضوع اول تا آخر انسان کا دکھ رہا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا انداز یہ ہے کہ زخم ایک ہی ہے۔ دہانِ زخم جدا جدا ہیں۔ اشفاق حسین لکھتے ہیں۔

> ''پہلے وہ سمجھتا تھا کہ غم جاناں کی موجودگی میں غم دوراں کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ اسے دنیا میں اپنے محبوب کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اب اسے ان گنت صدیوں کے تاریک اور بہیمانہ طلسم کا مکروہ چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ اب اس کی نظریں خاک وخون میں لتھڑے ہوئے جسموں کو سرِ بازار نیلام ہوتے ہوئے بھی دیکھتی ہیں۔'' (۴)

الیگزانڈر سرکوف لکھتے ہیں:

> ''فیضؔ اپنی شاعری، اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پُرخلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش وخروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوت صداقت اور توانائی الفاظ سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ عذابِ تنہائی اور جبری بے کاری کا شکار بنانے کے لیے انھوں نے منٹگمری اور حیدرآباد کی جیلوں میں فیضؔ پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط

کر دی تھی۔لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زنداں کی تاریک رات غالب نہ آ سکی اور نہ ایامِ اسیری کی بے حس اور جامد خامشی ان کے نغموں پر کوئی مہر سکوت ثبت کر سکی۔'' (۵)

نظم ''میرے ندیم'' میں محبت اور رومان کے دروازے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ محبت اور رعنائیاں جس میں شاعر الجھا تھا۔اب اسے پہلی بار ان میں شاعرانہ وجدان کے ختم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

''میرے ندیم'' پوری نظم سوالیہ نشان ہے۔شاعر خود حیران ہے کہ وہ احساسات، وہ آرزوئیں کہاں ہیں جن سے شعر کی دنیا میں جان تھی۔جس سے فضائے فکر و عمل رنگین تھی۔یہی نظم وہ حد ہے، جہاں شاعر شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بن جاتا ہے۔اردو ادب کو اب تک صرف تین ایسے شاعر میسر آئے ہیں۔(غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ) جو لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں۔ ہمیں پڑھو، ہمیں سوچو، ہمارے لفظوں پر غور کرو......مرزا غالب، ڈاکٹر محمد اقبال اور فیض احمد فیضؔ اپنے فن کے اندر وہ وسیع سمندر ہیں جن میں غوطہ خور صدیوں معانی تلاش کرتا ہے۔ بڑے فنکار کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکان اور پست و بلند سے بے نیاز ہو کر انسانیت کے رِستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔(۶)

''نقشِ فریادی'' کی نظم سوچ میں فیضؔ کہتے ہیں:

ایسی فضائیں میرا دل کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ جہاں نہ لوگ محنت کرتے ہوں، نہ مزدوری دیتے ہوں۔صرف مزدوروں کا لہو چوستے ہوں:

بے فکر لے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سُکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

''سرِ وادیِ سینا'' میں لفظ ''انتساب'' کو بڑے وسیع معنوں میں لیا ہے۔میری یہ جو شاعری میری اولاد کی مانند ہے۔ میں اسے اپنے غم کے نام کرتا ہوں۔یہ آج کا غم پورے زمانے سے خفا خفا لگتا ہے اور یہ زرد پتوں کا جنگل جو میرا دیس ہے۔میں نے انھیں زرد پتوں کو اپنا وطن بنا لیا ہے:

ہر کوئی مردِ خواں رس بہ گلو
ہر اک حسینہ رعنا، کنیز حلقہ بگوش
جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزم جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشان ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

پروفیسر سلامت اللہ خان فیضؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیضؔ کی شاعری میں جو چیز ابتداء سے کھٹکتی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے۔خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ لیکن پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ بہت کچھ شیلے کی طرح ان کی اکتائی، اکتائی سی نظریں اپنے گردوپیش پر پڑتی ہیں۔اپنے دور کی زوال پذیر نظروں سے مایوس ہوتی ہیں اور پھر اس نئے دور کی منتظر رہتی ہیں۔''(۷)

فیضؔ کی ابتدائی شاعری کا مرکزی محرک تنہائی اور انتظار ہے۔ایک خیال سے دوسرے خیال تک، ایک شعر سے دوسرے شعر تک ایک نظم سے دوسری نظم تک یہی دھاگا پرویا ہوا نظر آتا ہے۔یہ نظم انفرادی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے۔لیکن مجموعی طور پر وہ سب ایک ہی مالا ہیں۔فیضؔ کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف شکلوں میں اُجاگر ہوتے ہیں:

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرت دید ناتمام رہے؟
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

فیضؔ نے اپنی شاعری میں محبت واخلاص کے جس چمن کی آبیاری کی ہے، وہ ایک فہیم احساس ملال کے باعث زرد پتوں اور درد کی انجمن سے عبارت نظر آتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ بہار سے ناامید ہیں۔ان کی شاعری میں اس قدر کلوروفل ہے کہ وہ زرد پتوں میں زندگی کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں۔ہاں، یہ اور بات ہے کہ بعض حضرات نے طے کرلیا ہو کہ وہ فیضؔ کی شاعری کے اس مسیحائی رخ کی جلوہ آرائی قبول نہیں کریں گے۔فیضؔ، محبت اور دوستی کے شاعر ہیں۔انسانی اقدار کی بالادستی کے شاعر ہیں:

کوئی یارِ جاں سے گزرا کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

فیضؔ نے ظلم سے ٹکرانے، ناانصافی کا نشانہ بننے، زنجیر وسلاسل پہننے، آگ میں پھول کھلانے کے تاریخی استعاراتی اور تلمیحاتی انداز میں یوں درس استقلال دیا:

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

انھوں نے ایوب خان کو انتخابی نشان پھول ملنے پر اس سرخ پھول کو سرخ خون بہائے جانے کی علامت جانا اور اس دور کے دُہرے معاشرتی معیار کا مذاق یوں اڑایا:

دامن دامن رت پھولوں کی آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم شہر بہ شہر

فیضؔ کا فلسفہ زندگی اور انداز تفکر ہمیں بتاتا ہے کہ فیضؔ کمیونسٹ نہیں فقر وفکرِ ابوذر کے امین تھے۔ روس میں فیض کے کلام کا ترجمہ کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فیضؔ کی شاعری میں پائی جانے والی عالمگیر محبت، امن دوستی اور مساوات پسندی روسی شاعروں اور ادیبوں کو اپنے دل کی آواز لگی۔ فیضؔ نے اپنے اوپر اچھالے جانے والے کیچڑ اور تہمتوں کے طومار کو تخلیقی محرک جانا اور اپنے فکر وفن کو اس سے مزید نکھارا۔ فیضؔ نے درس وتدریس کی، فوج میں رہے۔ صحافت کاری کی، ٹریڈ یونینوں میں رہے، جیل خانوں میں گئے اور ان مختلف حالات میں ''دست تہ سنگ''، ''سر وادیٔ سینا''، ''دست صبا''، ''زنداں نامہ'' وغیرہ اور مجموعہ ''نسخہ ہائے وفا'' چھوڑا۔ ہر نئے مجموعہ کلام میں ان کا رنگ سخن نکھرتا گیا اور جوں جوں وہ فرد کی ذات کو باہر کی دنیا سے ہم آہنگ کر کے دیکھتے گئے۔ غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش سے ان کا فن کمال تک پہنچتا گیا۔ اقبالؔ کے بعد جس شاعر نے اپنے زمانے کو متاثر کیا وہ فیضؔ ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ایسے معاشرے کی آرزو ہے جو مساوات پر مبنی ہو، جس میں برابری کا احساس ہو، انسان کی عزت نفس محفوظ ہو اور اخلاقی اقدار کا بول بالا ہو۔ اگر یہ سب کچھ نہیں تو بشر کی زندگی موت سے بدتر ہے۔

فیضؔ کے فکر واحساس نے انھیں حوصلۂ اظہار بخشا اور انہی مقاصد کے لیے وہ عمر بھر پرورش لوح وقلم کرتے رہے:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے(۸)

فیضؔ زندگی کے عکاس، زندہ شاعر تھے، انھوں نے ادب برائے زندگی تخلیق کیا۔ وہ عام انسان کی پستیوں اور محرومیوں کا ازالہ چاہتے تھے اور پستے ہوئے لوگوں کو مصائب وآلام کی چکی سے نکالنا ان کا مطمحِ نظر تھا۔ اس لیے ان کے نزدیک شاعری خیالی باتوں کے بجائے حقیقت پسندی کا نام ہے۔ فیضؔ کا فلسفہ زندگی اور سوچ کسی تحریک کے تابع نہ تھی۔ البتہ ان کی فکری مماثلت ومطابقت انھیں ترقی پسند تحریک اور سوشلزم کے قریب لے آئی۔ سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ بھی ترقی پسندی اور سوشلزم کے خلاف ہرگز نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد قوم وملت اور رسم وآئین کی حد بندیوں کو ہٹا کر زندگی میں یگانگت اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنانا اور اخوت ومساوات کا علم بلند کرنا ہے لہٰذا اس تحریک کے تحت ادب کا منصب ومعیار یہ ٹھہرایا گیا کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ ترقی پسند مصنفین کے تخلیقی مقاصد کے سلسلہ میں فیض احمد فیضؔ نے افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اپنے مقالہ ''شاعری کی قدریں'' کے آخر میں بہت خوب لکھا ہے کہ شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔ اس لیے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر ہی نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اترے۔ فیضؔ نے زندگی کو موضوع بنا کر جس رعنائی خیال کا اظہار کیا وہ اس کی پہلی نمائندہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' ہے جس میں زندگی محبوب کا حسن دیکھنے کے بجائے زمانے کے حقائق اور تلخیوں کو دیکھنے کا نام ہے۔ دراصل فیضؔ کے نقطۂ نظر سے آزادی ملنے سے منزل سر نہیں ہوئی بلکہ اس آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور تعمیر وترقی کی راہوں پر گامزن ہونے سے منزل سر ہوگی۔ ان کے مطابق اس ملک میں ظلم واستحصال، معاشی ناہمواری اور سماجی لوٹ کھسوٹ کے ذمہ دار پاکستان بننے سے پہلے انگریز اور

اب خود ہم ہیں۔اس لیے فیضؔ نے غیر جمہوری آمرانہ حکومت (ایوب کے مارشل لاء) کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور آج بھی ہر جمہوری فلاحی اور تعمیری تحریک میں ان کے آوازۂ حق کی بازگشت گونجتی سنائی دیتی ہے۔(۹)

> ''فیضؔ عصر حاضر کا ایسا سقراط ہے جس کا سچ طالع آزما قوتوں کے لیے قابل برداشت نہیں۔ اس لیے اسے ہر روز زہر بھرے الزامات کے پیالے پلائے جاتے ہیں اور وہ منافقین کے سامنے الزامات کی صفائی پیش کرنے کی بجائے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے مخلص ساتھیوں کی سچائی کا اپدیش دیتا ہے، انسانیت کے لیے آدرش اور دلوں پر لگنے والے شکوک کے جالے صاف کرتا ہے۔''
>
> (منصور قیصر)

نعیم حیدر سید کی رائے پر اپنی گفتگو سمیٹتا ہوں:

> ''کون کہتا ہے کہ وہ بار بار کرۂ ارض پر بنائی گئی جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ وہ تو شروع ہی سے قیدی ہے......انسان دوستی کا، ضمیر کا، انصاف کا، راست گوئی کا، بے باکی کا، حب الوطنی کا، سوجھ بوجھ کا، عقل و دانش کا۔''

حوالہ جات

۱۔ ثمینہ محبوب، ڈاکٹر، فیض احمد فیضؔ......شاعرِ عصر، مشمولہ: ماہ نو، بیادِ فیض، جلد نمبر ۶۱، شمارہ نمبر ۵، لاہور: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۸ء، ص:۹۱

۲۔ آغا سلیمان باقر، ڈاکٹر، فیض احمد فیضؔ، اک محبِّ وطن نظریاتی شاعر، مشمولہ: ماہ نو، بیادِ فیض، جلد نمبر ۶۱، شمارہ نمبر ۵، لاہور: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۱ء، ص:۹۶

۳۔ فیض احمد فیضؔ، سرِ وادیٔ سینا، کراچی: مکتبہ دانیال، ص:۲۳

۴۔ فیض احمد فیضؔ ایک جائزہ، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۱۹۷۷ء، ص:۳۸

۵۔ الیگزانڈر سرکوف، ایک حوصلہ مند درد کی آواز، سرِ وادی سینا، کراچی: مکتبۂ دانیال، ص:۱۹

۶۔ ع۔ادیب، فیض ہر عہد کے شاعر، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، لاہور، ۲۸ نومبر ۱۹۸۴ء

۷۔ سلامت علی، پروفیسر، شاعر محبت، شاعر انسانیت، مشمولہ: افکار، فیض نمبر ۳۳۹

۸۔ مظہر عباس، چوہدری، فیض اور پرورشِ لوح و قلم، مشمولہ: ماہِ نو، بیادِ فیض، جلد نمبر ۶۱، شمارہ نمبر ۵، لاہور: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز، مئی ۲۰۰۸ء، ص:۱۲۱

۹۔ ایضاً، ص:۱۲۱

☆......☆......☆